© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اس صدی کے اوائل سے، جب سے کہ مسلمان ملکوں میں بالخصوص مطلق العنان شخصی بادشاہتوں کی جگہ جمہوری نمائندہ حکومتیں قائم کرنے کا جذبہ اُبھرا ہے، مسلمانوں کے قدیم اور جدید گروہوں یا زیادہ معین الفاظ میں قدامت پسند علماء اور تجدید خواہ طبقوں میں باقاعدہ طور پر کشمکش شروع ہے۔ بعض مسلمان ملکوں میں اس کشمکش کا زور تقریباً ختم ہوگیا ہے۔ بعض میں گو یہ کشمکش ایک حد تک جاری ہے، لیکن بظاہر تجدید خواہ طبقے غالب ہوتے نظر آتے ہیں، لیکن چند ایک اسلامی ملک ایسے بھی ہیں، جہاں یہ کشمکش اس وقت پورے شباب پر ہے۔ اور دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف پوری قوت سے نبرد آزما ہیں۔ ان ملکوں میں سے ایک ہمارا ملک پاکستان ہے۔

○

ہمارے اکثر قدامت پسند علماء کا جدید رجحانات کی مخالفت کرنا بالکل فطری ہے۔ بات یہ ہے کہ ہماری تاریخ کا وہ دور، جس میں ہمارے ہاں مطلق العنان شخصی بادشاہتیں رہیں، اس کی ہیئت سیاسی میں صرف دو قوتیں مؤثر و فعّال ہوتی تھیں۔ ایک بادشاہ اور اُس کے امراء، دوسرے علماء۔ اوّل الذکر سیاسی اقتدار پر قابض ہوتے، اور علماء دین اسلام کے ترجمان و شارح اور دینی زندگی کے محافظ و مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ مملکت کے قانون ساز بھی تھے۔ یعنی آج ہماری موجودہ ہیئت سیاسی میں جو منصب قومی اسمبلیوں کا ہے، اس منصب پر ہماری ملّی تاریخ کے اس دور میں جو تقریباً گیارہ سال تک رہا، حضرات علماء فائز تھے۔ مطلق العنان بادشاہوں کو کسی نہ کسی حد تک انسانی و اسلامی ضابطوں کا پابند رکھنے میں ہمارے بیشتر علماء کا بڑا شاندار کردار رہا ہے، اور اس پر ہم جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطلق العنان شخصی بادشاہتوں کے اس دور میں علماء کرام کا اس منصب پر فائز ہونا ایک بہت بڑی نعمت تھی۔ اور انھوں نے اس منصب کے حقوق بہت حد تک خوش اسلوبی سے ادا کئے۔ مطلق العنان شخصی بادشاہت کے لئے علماء کا وجود ایک مرشد و معلم کا بھی تھا اور محاسبؔ مصیطر کا بھی۔

---o---

ترکی کی مشہور مصنفہ خالدہ ادیب مرحومہ نے اپنی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" میں ترکوں کے عثمانی سلاطین کے دور میں علماء کا جو کردار رہا ہے، اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک زمانے میں علماء عثمانی سلطنت کا ذہن تھے، وہ اس کی ضمیر تھے، اور سلطان سلیم جیسے خودسر اور سفاک فرمانرواؤں کو قابو میں رکھنے والے تھے، لیکن ایک وقت آیا کہ انھوں نے اپنے دماغوں کے دریچے بند کرلئے، اور جو کچھ صدیوں پہلے لکھا اور سوچا گیا تھا، اسے ہی حرفِ آخر سمجھ کر بیٹھ گئے، ہر نیا فکر، ہر نئی ایجاد اور ہر نیا اقدام ان کے ہاں بدعت اور ضلالت قرار پایا۔ اور چونکہ تعلیم ان کے ہاتھ میں تھی، قانون سازی کے مجاز وہ تھے اور سلطنت اور عوام کی عملاً ضمیر وہ تھے، جب وہ فرسودہ، بےجان اور بے روح ہوگئے۔ تو ساری ترکی قوم کا بھی حشر ہوا اور اسے یورپ کا مردِ بیمار کہا جانے لگا۔

---o---

یہی زمانہ ہے جب ترکوں میں جمہور کی نمائندہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اب اس مطالبے کی زد ایک طرف تو مطلق العنان سلاطین پر پڑتی تھی، اور دوسری طرف اس سے علماء کے اختیارات، جو مطلق العنان بادشاہتوں کی طرح لامحدود تھے اور نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی بلکہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی تک پر محیط تھے، معرض خطر میں پڑتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں عالمِ اسلام میں سیّد جمال الدین افغانی کی دعوت کی جہاں مطلق العنان مسلمان فرمانرواؤں کی طرف سے مخالفت ہوئی، وہاں قدامت پسند علماء بھی اس میں پیش پیش رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترکی میں سلطان عبدالحمید نے کوئی ۳۳ سال تک اپنی شخصی مطلق العنانی مسلط رکھی، اور اس میں قدامت پسند علماء اس کی سب سے بڑی قوت تھے۔ اس کے خلاف جو ردِ عمل ہوا، وہ جدید ترکی ہے۔

روسی ترکوں کے ہاں سید جمال الدین افغانی کے مسترشدین نے اصلاحی تحریکیں شروع کیں، انھوں نے اسلامی اصولوں، اسلامی روایات اور اسلامی ضوابط حیات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے جدید زمانے کی ضرورتوں کے مطابق اپنے ہاں تعلیمی و معاشرتی اصلاحات کرنی چاہئیں۔ ان مفید و تعمیری اصلاحات کی زار روس کی حکومت نے اتنی مخالفت نہیں کی، جتنی روسی ترکوں کے قدامت پسند علماء نے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روسی ترک مصلحین کی یہ سب کوششیں ناکام ہوئیں، اور آخر میں وہاں کیونزم آیا اور ان حالات میں اسے آنا ہی تھا۔

افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ مرحوم کی یاد برّ صغیر کے مسلمانوں کے دماغوں سے ابھی محو نہیں ہوئی ہوگی۔ بے شک شاہ مرحوم اپنے جوشِ اصلاح میں ذرا حد سے بڑھ گئے تھے، لیکن کیا اُن جیسا محب الوطن، عوام کا بہی خواہ اور کچھ کر گزرنے کا عزم رکھنے والا بادشاہ اس سلوک کا مستحق تھا۔ امان اللہ خان ناکام ہوئے۔ لیکن آج کا افغانستان انہی کے نقوشِ قدم پر چل رہا ہے۔

چند سال کی بات ہے۔ افغانستان کے ایک شہر میں چند لڑکیاں برقعے اور حجاب کے بغیر برسرِ عام دیکھی گئیں۔ اس پر وہاں کے قدامت پسند علماء کے ایک گروہ نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ مجبوراً حکومت کو حفظ امن کے لئے کارروائی کرنی پڑی اور سب ہنگامہ کرنے والے گرفتار کر لئے گئے اور حکومت کی طرف سے انہیں بتا دیا گیا کہ اب افغانستان میں علماء کے تعاون کے بغیر حکومت ہوگی اور اُن کو آئندہ کے لئے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔

شیخ محمد عبدہ جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل عالم تھے، انھوں نے سیّد جمال الدین افغانی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان کے خیالات سے متاثر ہوئے، ایک وقت میں شیخ محمد عبدہٗ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے جامعہ ازہر کی اصلاح کرنی چاہی، لیکن ان کی شدید مخالفت ہوئی۔ انھوں نے مصر کی نئی معاشرتی اجتماعی اور معاشی زندگی کی ضرورتوں کے مطابق بعض رائیں دیں، جنہیں قدامت پسند علمائنے کفر و زندقہ سے تعبیر کیا۔ اور اس طرح وہ ساری عمر شیخ محمد عبدہ کی مخالفت کرتے رہے۔

اب جامعہ ازہر کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ شیخ محمد عبدہ اپنے وقت میں اس کے نصاب میں جغرافیہ اور اس طرح کے ایک دو مضمون شامل کرنا چاہتے تھے، لیکن علماء نہ مانے۔ اب ازہر میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بھی پڑھائے جائیں گے۔ اور وہ بالکل ایک جدید طرز کی یونیورسٹی ہوگی۔ البتہ اس میں دینی علوم کی تعلیم کا خاص انتظام ہوگا۔

مصر کا رقبہ محدود ہے اور اس کی آبادی اور ملکوں کے مقابلے میں غیر معمولی سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ وہاں کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اگر اس اضافۂ آبادی کو نہ روکا گیا تو بیس تیس سال کے بعد تمام آبادی کو دو وقت روٹی دینا تک مشکل ہو جائے گا۔ اب یہ ملک کی ایک فوری ضرورت ہے۔ جس سے کوئی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ اب وہاں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل ہو رہا ہے، اور فرداً فرداً اس سے اختلاف کرنے کے باوجود مذہبی طبقے بحیثیت ایک منظم طاقت کے اس میں حائل نہیں ہو رہے، یا انہیں حائل ہونے کے قابل نہیں رہنے دیا گیا۔ جامعہ ازہر بھی ہے، علمائے ازہر بھی ہیں، مذہبی طبقے بھی ہیں، لیکن اب وہ قومی رائے عامہ کے ممد و معاون ہیں، اس کے سیاسی حریف نہیں۔

سعودی عرب میں شاہ فیصل کے دور میں جس وسیع پیمانے پر اصلاحات ہو رہی ہیں، اس کی خبریں ہمارے ہاں برابر چھپتی رہتی ہیں۔ ۲۷ رمئی کے "پاکستان ٹائمز میں" سعودی عرب کا بدلتا ہوا معاشرہ " کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار — " لڑکیوں کی تعلیم " کے ذکر میں لکھتے ہیں :- ۱۹۶۱ء میں درعیہ میں لڑکیوں کے مدرسے کی پہلی جماعت شروع کی گئی اس میں صرف ۱۲ طالبات تھیں اور لوگ اس بدعت سے کچھ متوحش سے تھے۔ اب اس قسم کے ۲۴ ادبی مراکز میں ۱۶۱۵ دن کی اور ۹۵۲ رات کی جماعتیں ہیں۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ان سالوں میں سعودی خواتین عزلت کی زندگی سے نکل کر عوامی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگی ہیں۔ وہ تعلیم حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کے بعد قومی تعمیر کے کاموں میں شریک ہو رہی ہیں، ان کے لئے مدارس میں بحیثیت استانیوں کے، سماجی بہبود کے اداروں میں بطور سماجی کارکنوں کے اور ہسپتالوں میں بحیثیت نرسوں کے مواقع برابر نکل رہے ہیں۔

اور یاد رہے کہ سعودی عرب اور افغانستان دو ایسے مسلمان ملک تھے، جہاں نئی تعلیم اور نئی زندگی کے آثار سب سے کم تھے، اور قدامت پسندی اور قدامت پسند علماء کا پورا تسلط تھا۔ لیکن آج جس سرعت سے وہاں معاشرتی تبدیلیاں آ رہی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام کے یہ سب سے زیادہ قدامت پسند ملک بہت جلد تجدید خواہ مسلمان ملکوں کی صفوں میں پیش پیش شامل نظر آئیں گے۔

اس صدی کی ابتداء سے لے کر اب تک مسلمان ملکوں میں قدامت پسندی اور تجدید پسندی کی کشمکش کی جو صورت حال رہی، اس کا سرسری خاکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ دنیا کے ہر معاشرے میں پرانی نسلوں اور نئی نسلوں کے رہن سہن کے طریقوں اور ان کے خیالات میں اختلاف رہتا ہے اور ان میں کسی نہ کسی حد تک کشمکش کا ہونا فطری ہے، لیکن یہ کشمکش دو نسلوں کے محض مختلف نقطہ ہائے نظر یا مختلف عادات و اطوار کی بناء پر ہوتی ہے، اور اس کی جڑیں زیادہ دور تک نہیں جاتیں۔ چنانچہ وقت خود ہی اس کا علاج کر دیتا ہے اور یہاں تک نوبت نہیں پہنچتی، جیسا کہ بعض مسلمان ملکوں میں ہوا کہ ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے خلاف سخت اقدام کرنے پڑیں۔

دنیائے اسلام کا شائد ہی کوئی ایسا ملک ہو، جہاں کے مسلمان اصحابِ اقتدار کو قومی ضرورتوں اور انتظامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی حد تک قدامت پسند علماء کے ایک گروہ سے ٹکر نہ لینی پڑی ہو۔ شائد یہی وجہ ہے کہ اس تمام عرصے میں مسلمان ملکوں میں جہاں بھی وسیع پیمانے پر دُور رس معاشی، سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کے لئے اکثر فوجی قیادتوں ہی کی ضرورت پڑی۔ اور ان کو عام طور سے علماء کے اس طبقے سے نمٹنا پڑا۔ یہ کیوں؟ ان سطور میں مختصراً اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمہور کی نمائندہ حکومت کے نظریے اور سیاسی زندگی میں اس کی عملی تطبیق نے مسلمانوں کے ہاں سے مطلق العنان شخصی بادشاہتوں کے دور کو تو ذہناً بھی اور عملاً بھی ختم کر دیا، لیکن ہماری ان بادشاہتوں کے ساتھ ساتھ تقریباً ایک ہزار سال تک عام مسلمانوں میں یہ جو عقیدہ راسخ رہا کہ ایک مسلمان ملک کا آئین و قانون اسلامی ہونا چاہیئے، اور اس کی تعین و تشریح کا آخری و قطعی حق صرف علماء کو ہے، وہ ایک حد تک قائم ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کے خالص مذہبی احکام کا تعلق ہے، ان کے بارے میں علماء، غیر علماء کو رائے دینے کا سرے سے حق ہی نہیں دیتے، اور یہ ان کے نزدیک بلا شرکت غیرے ان کا خصوصی دائرہ ہے۔ اب رہ گئے ملک و قوم کے دوسرے مسائل، اس سلسلے میں علمائے کرام کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ اسلام میں دین اور دنیا کی کوئی تمیز نہیں اور دنیا دین کے تابع ہے، اس لئے وہ ان مسائل میں بھی' جنہیں عام طور پر دنیوی کہا جاتا ہے، دخل دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خواہ صدارتی نظام اور پارلیمانی نظام کا سوال ہو، خواہ جداگانہ انتخاب کا یا خاندانی منصوبہ بندی یا زرعی اصلاحات کا فیصلہ کرنا ہو، غرض کوئی مسئلہ ہو، علمائے کرام اس کے بارے میں دینی نقطۂ نظر سے رائے دینا اور عوام کو دین کے نام سے متاثر کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مثال کے طور پر پاکستان میں ہمارے علماء کا طبقہ سب سے زیادہ فعال، متحرک اور ناطق ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے صرف اپنے دینی مسائل ہی نہیں، بلکہ دنیا جہاں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل بھی ہیں، جن پر وہ رائے دیتے ہیں۔

بے شک اس میں کوئی حرج نہ تھا اگر ہمارے علمائے کرام اس دور کے علوم، اس کی ضرورتوں اور یہ دور مستقبل کی کن راہوں کی طرف جا رہا ہے، اس سے واقف ہوتے۔ اب حالت یہ ہے کہ سوائے چند مستثنیات کے ہمارے علماء کی غالب تعداد جدید علوم اور ان کی وسعتوں پر حاوی نہیں۔ اور نہ آج کی انفرادی و اجتماعی اور قومی و بین الاقوامی ضرورتوں اور اُن کے تقاضوں سے واقف ہے، لیکن ان کا مطالبہ ہے کہ ایک مسلمان مملکت میں کسی قسم کا قانون اُن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صوابدید کے بغیر نہ بنے ۔یعنی مطلق العنان شخصی بادشاہتیں گئیں تو گئیں ۔ لیکن ان کے طویل عہد میں علماء کو بحیثیت جماعت کے قانون سازی کا جو کلیتہً حق تھا ، وہ جمہور کی نمائندہ حکومت کے اس دور میں بھی ان کے پاس رہے ، اور اُن کو اور صرف اُن کو شریعتِ اسلامی میں حرفِ آخر سمجھا جائے۔

مختصراً یہ ہے لب لباب اُس تمام بحث کا ، جو اس وقت علمائے کرام کے غالب گروہ اور تجدید خواہ طبقوں میں جاری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آج جب تمام مسلمان ملکوں میں مطلق العنان شخصی بادشاہتوں کی مسندِ اقتدار جمہور کی نمائندہ حکومتوں کو منتقل ہو گئی ہے ، تو اِن بادشاہتوں کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر علماء کو بحیثیت ایک جماعت کے قانون سازی کا جو حق تھا وہ مسلمان جمہور کے نمائندوں کو کیوں نہ منتقل ہو ، بہت سے مسلمان ملکوں میں اس سوال کا جواب دیا جا چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ پاکستان میں بھی اس کا واضح طور پر عملاً جواب دیا جائے۔

ہمارے خیال میں اس میں جتنی تاخیر ہوگی ، پاکستان کی وہ قدرتی طاقتیں اور اہلِ پاکستان کی وہ ذہنی و جسمانی صلاحیتیں جو اس مملکت کو ایک عظیم ، اقبال مند ، خوشحال اور طاقت ور مملکت بنا سکتی ہیں ، آج کی طرح ضائع ہوتی رہیں گی ۔

پاکستان ایک قومی مملکت ہے ، جس کی کہ اساس اسلام ہے ۔اب اس مملکت کے استحکام اور ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں قومیت کا شعور زیادہ سے زیادہ فروغ پائے اور جس طرح گزشتہ ستمبر میں ہندوستان کی جارحیت کے خلاف پاکستان کے عوام نے اس شعور کا مظاہرہ کیا تھا ، ہماری پوری زندگی اسی رنگ میں رنگی جائے اور ہم ایک متحد مضبوط اور باشعور قوم بن جائیں۔اس کے ساتھ ساتھ ہمارے دین اسلام کی حقیقی روح ، اس کے اصول و مقاصد اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے فکر و عمل کی جو وہ راہیں تجویز کرتا ہے ، ان سے ہماری جذباتی ، ذہنی اور عملی وابستگی بھی بڑھے اور عملاً اچھے پاکستانی کے معنی ایک اچھا مسلمان سمجھے جائیں۔ یہ ہماری قومی زندگی کا نصب العین اور "آیڈیل" ہونا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیئے۔ اب اس آئیڈیل کا حصول کیسے ہو؟ یہ مسئلہ ہماری غیر معمولی توجہ چاہتا ہے۔

○

قومیت کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ قوم کا ہر ہر فرد اپنے آپ کو قوم کا ایک جزو لاینفک سمجھے اور اس اعتبار سے اس میں اور قوم کے دوسرے افراد میں کسی قسم کی مغائرت نہ ہو، جب تک کوئی قوم اس طرح ایک نہیں بنتی، وہ آج کے دور کی سخت کشمکشوں میں کبھی بھی اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ ایک فرد اور ایک قوم کی حفظِ ذات اور جہد للبقاء کی یہ پہلی ضرورت ہے۔

ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہاں یہ کہنا پڑتا ہے پاکستانی قوم کو اس طرح کی جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی دینے اور اسے شعوری وعملی طور پر ایک بنانے میں ہمارے ہاں کی مذہبی قدامت پسندی سب سے بڑی روک ہے۔ مذہبی قدامت پسندی کا لازمی نتیجہ فرقہ وارانہ عصبیت ہے۔ اور اس عصبیت سے لامحالہ وہی بحثیں اُٹھیں گی، جو صدیوں تک ملّتِ اسلامیہ کے تفرقہ و انتشار کا باعث بنیں، اور آج بھی ہمارے ہاں ان کی گرما گرمی موجود ہے۔ اس عصبیت کو ختم کرنے کا واحد طریق یہ ہے کہ جس طرح کاروبارِ حکومت میں جمہور کی رائے زیادہ سے زیادہ مؤثر ہوتی جارہی ہے، اسی طرح مذہبی دوائر بھی کسی ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری نہ رہے بلکہ کاروبارِ حکومت کی طرح ان میں بھی جمہور کی رائے کو دخل ہو، شرعی زبان میں اسے اجماع کا نام دیا گیا تھا، اور اس تک پہنچنے کے لیئے اجتہاد لازمی تھا۔

جب تک اسلام ایک زندہ، حرکت آفریں اور آگے بڑھنے والی طاقت تھی، مسلمانوں میں اجتہاد پر عمل رہا اور کسی قانونی تعبیر کی آخری حجت اجماع ہوتی تھی، لیکن جب اس کا حق صرف علماء تک محدود کر دیا گیا تو ایک تو اس سے قدامت پسندی راسخ ہوئی، دوسرے فرقہ وارانہ عصبیت کو فروغ ہوا، اور اس طرح اس اُمت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

○

ہمارے ہاں کے مختلف مذہبی فرقوں کی "سیٹجوں" اور اُن کے رسالوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے اور قوم کے متوسط اور نچلے متوسط طبقوں میں اس سے جس طرح ذہنی انتشار اور ایک دوسرے سے منافرت پیدا ہو رہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ مذہبی زندگی میں اس طرح کی انارگی اور فرقہ وارانہ عصبیت کو ہوا دینے والی اس قدامت پسندی کو بے عنان چھوڑ کر ہم پاکستان کو قلباً، ذہناً اور عملاً متحد کر سکتے اور اسے ترقی دے سکتے ہیں، تو وہ اس کی بڑی خوش فہمی ہوگی۔

○

© rasailojaraid.com